تنقید و تبصرہ

آثار الصنادید

سرسید علیہ الرحمۃ نے اپنی یہ مشہور کتاب پہلی دفعہ ۱۸۴۷ء میں شائع کی۔ دوسری دفعہ مرحوم و مغفور نے خود ہی اسے قدرے مختصر کر کے ۱۸۵۲ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ مشہور فرانسیسی مستشرق گارسان دی تاسی نے اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں (۱) شہر (شاہجہان آباد) کے باہر کی عمارتوں کا حال ہے۔ (۲) قلعہ معلی (لال قلعہ) کے حالات اور اس کی عمارات کا حال ہے۔ (۳) خاص شہر شاہجہان آباد کا حال ہے۔ (۴) دلّی اور دلّی والوں کا بیان ہے۔ (۵) مشائخین کبار، علمائے کرام اور علمائے دین کا ذکر ہے۔ (۶) ذکر قرّاء و حفاظ۔ (۷) بلبل نوایان سواد جنت آباد حضرت شاہجہان آباد کا ذکر۔ (۸) خوشنویسوں، مصوّروں اور ارباب موسیقی کا بیان ہے۔

یہ کتاب ایک عرصے سے نایاب تھی، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے بڑا اچھا کیا کہ اُسے شائع کر کے اہلِ علم کے لئے اس سے استفادہ کرنا ممکن

بنا دیا ہے ۔

مرتب اور محشی ڈاکٹر سید معین الحق نے اصل کتاب میں جہاں بھی ضرورت سمجھی ہے حاشیوں کا اضافہ کیا ہے جو کافی معلومات افزا ہیں ۔ اور آخر میں مولوی ظفر حسن صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر محکمہ آثارِ قدیمہ ہند کی دہلی کے اور آثارِ قدیمہ سے متعلق مرتبہ کتاب سے ۸۴ صفحات پر مشتمل کتبات لکھے گئے ہیں ۔

سرسید نے جب یہ کتاب لکھی تو نام کو تو مغل بادشاہ فرمانروا تھے مگر حکم کمپنی بہادر کا چلتا تھا، اور اس کے مقرر کردہ انگریز افسر دہلی کے حاکم تھے ۔

اس کتاب کا انتساب جو " سر طامس تیا فلس مٹکف بارونٹ صاحب کلاں بہادر دارالخلافہ شاہجہان آباد دام اقبالہٗ " کے نام ہے، ملاحظہ ہو :-

" جب یہ نسخہ مرتب ہو چکا اور اس کا حُسن شاہدان غلخ و نوشاد سے زیادہ نظر آیا ۔ اپنے اندیشۂ معنی پرست میں یہ گزرا کہ اس کو کسی نام اور بلند مرتبہ کے نام نامی اور اسم گرامی سے پیرایہ دیا جاوے اور اس کو کسی جسم اقتدار گردون وقار کے محامد پسندیدہ سے مزین کیا جاوے ۔ اسی اثنا میں عالم بالا سے ندا آئی اور عالم علوی سے نوید پہنچی کہ زیور اس شاہد حجلۂ غیب کا اسم سامی اس عالی منزل گردوں بارگاہ کا ہو سکتا ہے کہ جس کا خیمہ جاہ فلکِ نہم سے بالا ہے ۔ اور اس کے ادنیٰ خادم کا مرتبہ سکندر و دارا سے والاتر دولت اقبال کا طراز اور فضل مقام حقیقی اس کا کارساز دارا کو اگر اس کی اعانت پہنچتی سکندر سے شکست نہ کھاتا اور افراسیاب کو اگر اس کی توجہ کرتی تو رستم سے الزام نہ پاتا ۔

نظم

سکندر شکوہے کہ در جملہ ساز شکوہے سکندر بدو گشت باز
طرف دار پنجم بمردانگی قدرخان مشرق بفرزانگی

والی جہاں دارا دربان صاحب دولت و اقبال خداوند جاہ و جلال مسند آرائے کشور فرما ندہی و کشورستانی حاکم محاکم عدل سنجی و جہانبانی مؤید بتائید آسمانی بانی جنانی عدل نوشیروانی نصرت را دولت پیرا جہاں کشا حاجت روا مروائے خلائق و پسندیدۂ حضرت خالق عدل پرور انصاف گستر آسمان پایۂ رفعت سرمایہ معظم الدولہ امین الملک اختصاص یارخاں فرزند ارجمند بجان پیوند سلطانی سرطامس . . . دام اقبالہٗ ''۔

اس کے بعد سرسید نے اپنے اس ممدوح سرمٹکاف کی مزید تعریف میں ایک مثنوی لکھی ہے، جس میں اُسے "حبطِ رحمتِ الٰہی" بتایا ہے اور لکھا ہے کہ وہ تاج ور جو تاجدار ہیں ، بردرگہ او جبیں گزارند'۔ اور اس کی عدل گستری کی یہ حالت ہے کہ جب آسمان پر اُس کے عدل نے آواز دی تو آسمان نے صد توبہ زیک جفا ادا کرد'۔

اور اس انتساب کا اختتام یوں ہوتا ہے :۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہر چند یہ کتاب نظر تماشائیانِ دقیقہ یاب میں رشکِ گلزار اور غیرتِ بہار ہے ، لیکن حقیقت میں بہار جب ہے کہ اس دریا دل کے سحابِ الطاف سے سرمایہ خرمی واصل کرے اور گلزار جب ہے ، کہ اس بحرِ کف کے ابرِ غیا سے سرسبزی پاوے ۔ ۔ ۔ ۔ "

قطب صاحب کی لاٹ کے پاس پُرانے وقتوں کی ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت تھی جسے اسی سرمٹکاف نے مرمت کرایا تھا، اس کا ذکر سرسید یوں کرتے ہیں صفحہ ۸۳ :۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن جب کہ اس کے نصیب کھلے اور اس عمارت کے دن اچھے آئے، اُسے صاحب والا مناقب عالی مناصب نے جن کے عدل وانصاف کے آگے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتا ہے اور ظلم وستم دنیا سے نیست ونابود ہوگیا ہے آوازہ بلند ہمتی اور والا فطرتی کا آویزۂ گوش فلک ہے اور غلغلہ ان کی شوکت و حشمت کا زمین سے آسمان تک پہنچا ہے یعنی دریا نوال خدا یگان ابر کف حاتم دررائے فرزند ارجمند بجان پیوند سلطان معظم الدولہ امین الملک اختصاص یار خواہی طامس تیا فلس متکف صاحب بہادر فیروز جنگ بہادر شاہجہان آباد دام اقبالہٗ نے اس مقام پر کوٹھی بنانے کا ارادہ کیا ۔ ۔ ۔"

قلعہ معلی کی عمارات کے حال میں مصنف نے " ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہٗ وسلطانہٗ وافاض علی العالمین برہ واحسانہ" کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں :۔

"الحمدللہ کہ یہ قلعہ معلی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اِسے شاہنشاہ عالم پناہ کے وجود باجود سے رونق پذیر ہے کہ نوشیرواں کو اس کے ایوانِ عدالت میں مرتبہ ادنیٰ چاکر کا اور سکندر کو اس کی بارگاہ میں کمترین رتبہ نوکر کا ہے۔ خزاں ان کے عہدِ دولت میں برنگ بہار اور خار اُن کے زمانۂ سلطنت میں غیرتِ گلزار ۔ ۔ ۔ ۔"

کتاب آثار الصنادید صرف دہلی کے آثارِ قدیمہ، سرسید کے زمانے کی عمارات اور ان کے اہلِ علم و کمال کے حالات کا مرقع نہیں، بلکہ اُس دور کی ان بوالعجبیوں کو بھی پیش کرتی ہے کہ ایک طرف مغل شاہنشاہ کا وجود باجود رونق پذیر تھا، اور اور دوسری طرف سر متکف صاحب بہادر عملاً حکمرانی کرتے تھے اور سرسید اور غالب جیسے بے شمار اہلِ قلم کو ان دونوں بارگاہوں کو خراجِ عقیدت

پیش کرنا پڑتا تھا۔

سرسید نے آثارِ قدیمہ کا کھوج لگانے اور ان کے بارے میں جملہ معلومات فراہم کرنے میں حد درجہ محنت اور مشقت کی تھی۔ مولانا حالی نے حیاتِ جاوید میں لکھا ہے کہ وہ قطب لاٹ کے کتبے پڑھنے کے لئے لاٹ کے ساتھ رسی اور ٹوکری باندھ کر لٹک جاتے تھے اور اس طرح انہوں نے لاٹ کے کتبے پڑھے، اور اُن کا اپنی کتاب میں اندراج کیا۔

اس ضمن میں سرسید لکھتے ہیں :-

"اس تمام لاٹ میں آیاتِ قرآنی کندہ ہیں۔ اُن کے بیان کرنے کی تو کچھ حاجت نہیں مگر چہ کتبے اس لاٹ کے قابل بیان کرنے کے ہیں کہ ان میں اس لاٹ کے بنانے والے اور مرمت کرنے والوں کے نام لکھے ہیں۔ اور ایک میں معمار کا نام بھی۔ چنانچہ وہ سب کتبے بعینہ اسی خط اور اسی طور سے نقشہ میں ہر ہر درجہ کے مقابل موجود ہیں۔ ... ان کتبوں میں بعضے حرف اور طرح سے خلاف رواج لکھے ہیں اور بعضے پڑھنے میں نہیں آتے۔ غلطی ناقل کی اس میں نہ سمجھی جائے۔ اصل لاٹ پر بھی اسی طرح ہیں۔"

لاٹ کی اونچائی مصنف نے جس طرح ناپی، اس کا بھی انہوں نے ذکر کیا ہے لکھتے ہیں :-

"میں نے اس لاٹ کی بلندی کو اسطرلاب سے بعمل اصابع اور اقدام کے پیمائش کیا اور پھر ہر ہر درجہ کو ڈور سے بھی پرتالا ..."

دہلی سے قریب ادکھلا کے نواح میں کالکا مندر ہے۔ مصنف نے اُس کا بھی حال لکھا ہے، فرماتے ہیں :-

"جب میں اس مندر کا نقشہ کھینچنے گیا ہوں تو مجھ کو بھی وہاں کے پانڈوں نے بتاسے اور کشمش اور بادام ملا کر پرشاد دیا تھا۔ اور

میں نے لاچار اس خیال سے کہ مبادا وہاں کے پانڈے مجھ کو مندر کے اندر نہ جانے دیں اور مندر کا نقشہ نہ کھینچنے دیں، اس پرشاد کو لے لیا اور ہر طرح سے پانڈوں کی خاطرداری کی۔ شعر .

بہ تقلید کافر شدم روز چند برہمن شدم در مقالات ژند"

آثارِ قدیمہ اور عماراتِ تاریخی کا بیان تو اپنی جگہ مفید اور اہم ہے ہی لیکن کتاب کا وہ حصہ جس میں سرسید نے اپنے معاصر مشائخ، اہل علم، علماء دین اور شعراء اور اربابِ فنون کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ اس کی افادیت اور اہمیت ہمیشہ رہے گی۔

اُس دور کے مشہور بزرگ مولانا شاہ غلام علی سے سرسید کے خاندان کو بیعت تھی اور ان کے والد سرسید کو حضرت شاہ صاحب کے پاس لے جایا کرتے تھے۔ مصنف نے بڑی تفصیل سے حضرت کے حالات لکھے ہیں، لکھتے ہیں:-

"میں نے اپنے دادا کو تو نہیں دیکھا، آپ ہی کو حضرت دادا کہتا تھا"

اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:-

آپ کی ذات فیضِ آیات سے تمام جہاں میں فیض پھیلا۔ اور ملکوں ملکوں کے لوگوں نے آن کے بیعت اختیار کی۔ میں نے حضرت کی خانقاہ میں اپنی آنکھ سے روم اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی۔ اور خدمتِ خانقاہ کو سعادت ابدی سمجھے اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان اور پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امنڈتے تھے۔"

مصنف نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے بھائیوں حضرت شاہ رفیع الدین حضرت شاہ عبدالقادر اور اُن کے بھتیجے حضرت شاہ اسمٰعیل اور حضرت سید احمد شہید

کا بھی ذکر کیا ہے ۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے بارے میں لکھا ہے :۔

"باوجود اس کے کہ سنین عمر شریف قریب اسّی کے پہنچ گئے تھے اور کثرت امراض جسمانی سے طاقت بدن مبارک میں کچھ باقی نہ رہی تھی، خصوصاً قلتِ غذا سے۔ لیکن برکاتِ فیضِ باطنی اور حدّتِ قوائے روحانی سے حسب تفصیل مسائل دینی اور تبیین دقائق یقینی پر مستعد ہوتے تو ایک دریائے ذخار موج زن ہوتا تھا اور فرط افادات سے حضار کو حالت استغراق بہم پہنچتی تھی.."

شاہ رفیع الدین کے تبحر علمی اور فیض باطنی کا ذکر یوں کرتے ہیں :۔

"ہر فن کے ساتھ اس طرح کی مناسبت تھی کہ ایک وقت میں فنون متباینہ اور علوم مختلفہ درس فرماتے تھے . . . باوجود ان کمالات کے افاضۂ فیضِ باطن کا یہ حال تھا کہ جنید بغدادی اور حسن بصری اگر اُن کے وقت میں ہوتے تو بے شک وریب اس فن میں اپنے تئیں کمترین مستفیداں تصور کرتے ۔"

حضرت شاہ عبدالقادر کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں :۔ "ازبسکہ ترک حضرت کے مزاج میں بہت تھا۔ تمام عمر اکبری مسجد کے ایک حجرے میں بسر کی ۔ نیز باوجود اس کے کہ بسبب کثرت اخلاق کے کسی کے حق میں کچھ ارشاد نہ کرتے اور کسی کو نہ فرماتے کہ ادھر بیٹھ یا اُدھر، لیکن من جانب اللہ لوگوں کے دلوں میں آپ کا ایسا رُعب چھایا ہوا تھا کہ رؤسائے شہر جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے بسبب ادب کے دور دور بیٹھتے اور بدون آپ کی تحریک کے مجال سخن نہ پاتے اور ایک دو بات کے سوا یارا نہ دیکھتے کہ کچھ اور کلام کریں ۔"

سرسید نے حضرت سید احمد شہیدؒ کے ذیل میں شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحی کے بارے میں ایک دو ایسی باتیں لکھی ہیں جو سمجھ میں نہیں آتیں ۔ ص۲۳ میں لکھتے ہیں :۔ " مولانا اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی کو اجازت ہوئی کہ اطراف ہندوستان

میں وعظ کہو اور بیشتر جہاد اور فضیلتِ شہادت بیان کرو۔ ہرچند یہ اس کام
نہ جانتے تھے اور پے نہ لے گئے (؟) کہ اس ارشاد کا سبب کیا ہے لیکن چونکہ وہ
با اخلاص تھے، سرِ مو تجاوز نہ کیا اور فرمان بجا لائے۔"

اس کے بعد مصنف نے لکھا ہے: "... بعد مدت کے ان بزرگوں کو حضرت
نے لکھا کہ اب ہمارے پاس چلے آؤ۔ یہ تو جاں نثار تھے بمجرد حکم کے مشتاقینِ وعظ کو
چھوڑ کر خدمت بابرکت میں راہی ہوئے اور حضرت ان کو ہمراہ لے کر کوہستان
چلے گئے اور یہ ہنوز اس کی منشا سے واقف نہیں..."

مطلب یہ کہ شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحی بغیر جانے بوجھے محض مرشد
کے ارشاد کی تعمیل میں پہلے جہاد کی دعوت دیتے رہے اور پھر خود عملاً جہاد میں شریک
ہوئے، یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔

بے شک پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے آثارالصنادید شائع کر کے ایک قابلِ قدر
خدمت کی ہے، لیکن اس کی یہ خدمت اور بھی قابلِ قدر ہوتی اگر یہ کتاب ذرا اور اہتمام
سے چھاپی جاتی۔ بہتر یہ تھا کہ ایسی اہم کتاب بجائے لیتھو کے ٹائپ میں چھپتی۔ کتاب
میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی ہیں، اور کئی فرموں کی طباعت بھی ناقص ہے۔

کتاب میں عربی نظم ونثر کے کئی کئی صفحات ہیں اور انہیں بجائے نسخ کے نستعلیق
میں لکھا گیا ہے، ذرا سی توجہ سے یہ عربی عبارتیں نسخ میں کتابت کرائی جا سکتی تھی جس
سے پڑھنے والوں کو بڑی آسانی رہتی۔

مجموعی طور پر آثارالصنادید کی اشاعت پر پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی مبارکباد
کی مستحق ہے۔

کتاب مجلد ہے۔ بڑے سائز کے ۴۶۴ صفحات، قیمت اٹھارہ روپیہ۔ ناشر
پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی۔ کراچی ۵۔

(ا۔ س)